تبصرے

سرِّ دلبراں | مصنفہ شاہ سید محمد ذوقی

اس کتاب کا نام "جس میں اصطلاحاتِ تصوف پر تشریحی بحث کی گئی ہے" فارسی کے اس مشہور شعر سے لیا گیا ہے:

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

مسلمانوں کی علمی و فکری، ادبی و شعری اور معنوی و روحانی تخلیقات کا جتنا بڑا سرمایہ تصوفِ اسلام کی شکل میں موجود ہے، اتنا مسلمانوں کے کسی اور فن اور شعبۂ علم کے متعلق نہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تصوفِ اسلام کا اصل جوہر اسلام سے مستفاد ہے اور معرفتِ حق کی جس باطنی کیفیت کو حدیثِ نبوی میں "احسان" سے تعبیر کیا گیا، بعد میں اسے ہی اصطلاحاً تصوف کا نام دیا گیا، اور اس پر ایک مستقل علم کی بلند اور وسیع و عریض شاندار عمارت کھڑی کر دی گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "القول الجمیل" میں لکھتے ہیں: "تصوف کے جتنے بھی طریقے ہیں، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفسِ ناطقہ کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کیفیت کو صوفیہ نے "نسبت" کا نام دیا ہے۔ اور اس کو نسبت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتساب اور ارتباط سے۔ یہ کیفیت نفسِ ناطقہ کے اندر حلول کرتی ہے۔ طالب جب عبادات، طہارات اور ذکر و اذکار پر برابر عامل رہے تو اس کے اندر یہ "نسبت" پیدا ہوتی ہے۔"

صوفیہ کے مختلف طریقوں میں نفسِ ناطقہ کے اندر اس "نسبت" کو پیدا کرنے کے لیے خاص خاص اشغال و وظائف مقرر ہیں۔ شاہ صاحب اپنی کتاب "القول الجمیل" میں ان کی تفصیل بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ بے شک ان اشغال و وظائف سے یہ "نسبت" پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: "صحابہ اور تابعین یہ "نسبت" اس طرح حاصل کرتے کہ خلوت میں پورے خضوع و حضور کے ساتھ نمازیں پڑھتے، ذکر و تسبیح کرتے اور اسی طرح برابر طہارت پر قائم رہتے۔ موت جو دنیاوی

لذتوں کو مٹانے والی ہے، اس کو ہردم یاد کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں برداروں کے لیے ثواب اور نافرمانوں کے لیے عذاب مقرر کر رکھا ہے۔ اس پر دھیان دینے سے مادی لذتوں سے ان کی طبیعت اچاٹ ہو جاتی اور دل ان سے بے تعلق ہو جاتا۔ چنانچہ اس طرح سے ان میں یہ نسبت پیدا ہو جاتی تھی۔"

اپنی ایک دوسری کتاب "ہمعات" میں شاہ صاحب نے پہلے تو اس امر کی صراحت فرمائی کہ دین کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ظاہری، دوسری باطنی۔ چنانچہ جہاں ظاہری حیثیت کی محافظ شروع سے فقہا، محدثین، غازیوں اور قاریوں کی جماعت رہی ہے، وہاں باطنی دین کی، جس کا دوسرا نام "احسان" ہے، حفاظت کی استعداد دوسرے گروہ کو عطا فرمائی۔ اس گروہ کے بزرگ ہر زمانے میں عوام الناس کے مرجع رہے ہیں۔ طاعت و نیکوکاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں، اور دلوں کو ان سے جو لذت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔ نیز یہ انھیں نیک اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ عام طور سے یہ ہوتا آیا ہے کہ ہر زمانے میں اولیاء اللہ میں سے کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ضرور پیدا ہوتا ہے، جس کو عنایت الٰہی سے اس امر کی استعداد ملتی ہے کہ وہ باطنی دین کے قیام اور اس کی اشاعت کی کوشش کرے۔ باطنی دین کہ اس کا مغز اور نچوڑ ہے "احسان" یعنی اللہ کی اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے سامنے دیکھ رہا ہے۔ یا اگر اتنا نہ ہو تو اسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ بزرگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس صفت "احسان" کا مظہر بنتا ہے۔ اور باطنی دین کی اشاعت اور اس کی حفاظت کا کام اس طرح اس بزرگ کے ہاتھ سے سرانجام پاتا ہے۔

یہ تھا در اصل تصوف اسلام کا محرک جذبہ اور یہ تھا اس کا مقصد، لیکن جب تصوف کی بحیثیت ایک مستقل علم کے تدوین ہوئی۔ اور اس میں زمانے کے ساتھ ساتھ اضافے ہوئے تو اس میں مختلف قوموں اور مذاہب کے فلسفیانہ افکار اور ان کے متصوفانہ خیالات بکثرت شامل ہوتے گئے۔ نیز باطنی کیفیات حاصل کرنے کے لیے صوفیہ نے جو اشغال و وظائف اپنائے، وہ کسی نہ کسی صورت میں بعض دوسرے مذاہب میں بھی رائج تھے۔ لیکن علم تصوف کے اندر یہ جو کچھ داخل ہوا، اسے اسلامی روایات، اسلامی اصطلاحات اور اسی طرح اسلامی عبادات کے رنگ میں پوری طرح رنگے جانے کے بعد داخل ہونے دیا گیا۔ اور

اس طرح یہ علم تصوف اسلامی علم تصوف قرار پایا۔ ایک اہل قلم کے الفاظ میں یہ ایک ایسا ذخیرۂ آب تھا، جس میں ہر طرف سے ندی اور نالے بہہ بہہ کر گرتے رہے تھے اور اس نے سب کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اب ہمارے اس علم تصوف میں "نسبتیں" حاصل کرنے کے اشغال و وظائف ہیں۔ باطن و ظاہر کی اصلاح کے مجرب ذرائع ہیں۔ عرفان و معرفت کے حصول اور مکاشفہ و مراقبہ کے طریقے ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارے تصوف کے عظیم ادبی سرمائے میں فلسفہ و حکمت ہے۔ نفسیاتی تجزیوں کے غیر محدود ذخیرے ہیں اور باطن کی دنیاؤں کے عجیب و غریب اسرار ہیں۔ تصوف کا یہ ادبی سرمایہ کوئی ایک ہزار سال سے جمع ہوتا رہا ہے۔ اور اس میں صرف اس طویل مدت کی ذہنی و وجدانی کاوشوں کا حاصل نہیں بلکہ اس سے ہزارہا سال پہلے سے اس سلسلے میں دوسری قوموں نے جو کچھ دریافت کیا تھا، وہ بھی ہمارے اس ادبی سرمائے میں برابر شامل ہوتا رہا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ آج ہمارے ہاں تصوف اسلام کا جو ادبی سرمایہ موجود ہے، وہ ہماری سب سے گراں قدر متاع علمی ہے، جسے ہم اس زمانے میں پوری انسانیت کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اور وہ اس سے طرح طرح کے علمی فوائد حاصل کر سکتی ہے۔

اسلامی تصوف کے عارفانہ نیز کائناتی و نفسیاتی حقائق فلسفہ کی زبان میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ اور اس ضمن میں جو اصطلاحات وضع ہوئیں، وہ کافی دقیق ہیں۔ چنانچہ جب تک انھیں پوری طرح نہ سمجھا جائے، یہ حقائق ایک معما بنے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "سیر دلبراں" میں انہی اصطلاحات کی تشریح ہے۔

فاضل مصنف دیباچے میں لکھتے ہیں: "ان اصطلاحات کے تحت میں (بقدر ضروری ہے) جو بحثیں آ گئی ہیں، ان سے تصوف کے مختلف پہلوؤں کی ملفوظی (لفظی کافی تھا) تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ گو تصوف ایک عملی چیز ہے، جس تک شیخ کامل کی رہنمائی کے بغیر رہنمائی تقریباً محال ہے، تاہم اس کتاب کے بغور مطالعہ سے اس فن کی مشکل کتابوں پر بھی عبور آسان ہو جائے گا۔"

مصنف کے اس بیان سے ہمیں بالجملہ اتفاق ہے کہ مصطلحات تصوف کی زیر نظر کتاب میں جو تشریحی بحثیں ہیں، ان کی مدد سے تصوف کے مشکل مقامات کے سمجھنے میں واقعی مدد

ملے گی اور اس لحاظ سے مصنف کی یہ کوشش کامیاب ہے۔ لیکن کتاب کے شروع میں جو مقدمہ ہے، ضرورت تھی کہ اس سے بہتر مقدمہ ہوتا اور اس میں تصوف پر خالص علمی انداز سے بحث کی جاتی۔ مثال کے طور پر مصنف نے ابن تیمیہ اور قاضی شوکانی کو "منکر تصوف" بتایا ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس تصوف کے یہ بزرگ منکر تھے، وہ واقعی انکار کا مستحق تھا۔ تصوف کے راستے عمل اور فکر کی بے شمار بے راہ رویاں اسلام میں گھس آئی تھیں۔ اور بہت سے صوفیائے کرام نے بھی ان کی مذمت فرمائی ہے۔ یہ گناہ صرف امام ابن تیمیہ اور شوکانی کا نہیں۔

اسی طرح مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "محدثین اور متکلمین کی ایک جماعت گزری ہے جنھوں نے ایک عرصہ تک گروہ صوفیہ سے اختلاف رکھا مگر بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی وہ بصیرت عطا فرمائی تو وہ اپنی روش سابقہ سے تائب ہوئے اور صوفیائے کرام کی جانب رجوع لائے ......" مصنف کا یہ بیان بھی صحیح نہیں۔ یہ گروہ صوفیہ جس سے شروع میں محدثین اور متکلمین کو اختلاف تھا، اس کے افراد اکثر شرعی حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔ اس احتساب کے بعد ہی تصوف میں اعتدال کی صورت پیدا ہوئی اور وہ شرع کی پابندی کرنے لگا۔

یہ تو مصنف کے مقدمہ کی بحث تھی۔ باقی جہاں تک اصطلاحات کی تشریح کا تعلق ہے وہ اس میں خاصے کامیاب ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے اصطلاحات کی وضاحت کرتے ہوئے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ تصوف کی اصطلاحات کی تشریح کیوں ضروری ہے، صرف ایک اصطلاح سے آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

لفظ "ترسا" کے لغوی معنی عیسائی کے ہیں۔ اب جو یہ لفظ تصوف کی اصطلاح بنا، تو اس سے کیا مراد لینے لگے، اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

ترسا: مرد روحانی، جس کا نفسِ امارہ مردہ ہو چکا ہو اور جس کے صفاتِ ذمیمہ مبدل بہ صفاتِ حمیدہ ہو گئے ہوں۔

ترسا بچہ: شیخ مکمل جو خود بھی کامل ہو اور دوسروں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وارداتِ قلبی جو سالک کے قلب پر وارد ہوں۔ حقیقت وحدت ذاتیہ۔ حقائق۔ معانی دقیقہ ——— ترسا بچہ کو کبھی ترسازادہ بھی کہتے ہیں۔

ترسائی: عموماً مسلک عیسوی پر چلنے والے کو ترسائی کہتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام پر بمقابلہ تشبیہ کے تنزیہہ کا غلبہ تھا، جو اس مسلک عیسوی پر تجرید و تفرید سے اپنے باطن کو آراستہ کرتا ہے۔ اور علائق دنیوی و عوائق طبیعی و قیودِ تقلید و رسوم و عادات سے آزادی حاصل کرتا ہے، اسے تصوف کی زبان میں ترسائی کہتے ہیں۔

قوم ترسا کی عبادت گاہ کو دیر کہتے ہیں۔ اس لیے صوفیہ کی اصطلاح میں قدس وحدت ذاتی کی جانب اشارہ ہوتا ہے جو منزہ ہے جمیع الواث کثرت سے۔ یہ معبد جان انسانی میں ہے، اور جان انسانی سے مراد روح انسانی ہے، اور روح متحقق ہے عالم تجرد سے۔

اب تصوف کی دو مشہور اصطلاحیں ہیں "جمع" اور "جمع الجوامع" ان کی تشریح کتاب میں یوں کی گئی ہے:

جمع: مشاہدۂ حق بے خلق۔ حق تعالیٰ میں اس درجہ محو ہو جانا کہ کسی اور کی خبر نہ رہے۔ جمع ضد ہے فرق کی۔ فرق کہتے ہیں حق سے محجوب ہونے کو بوجہ خلق کے۔ یعنی یہ کہ خلق ہی کو دیکھے اور حق کو من کل الوجوہ غیر جانے۔

جمع الجوامع: اس حقیقت کا انکشاف کہ خلق حق سے قائم ہے۔ اس مقام پر حق کا جمیع موجودات میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ سالک یہاں حق کو خلق سے اور خلق کو حق سے دیکھتا ہے اور حق و خلق کو خلق میں دیکھتا ہے یعنی خلق کو خلق اور حق کو حق دیکھتا ہے۔ اور ایک کو دوسرے کا "عین" پاتا ہے:

کبھی حق کو عالم سے دیکھیں منزّہ کبھی عالم و حق ہم دیکھتے ہیں (کاظم رح)

اس مقام کو فرق بعد الجمع اور فرق ثانی اور صحو بعد المحو بھی کہتے ہیں۔ یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے اور سلوک میں اس سے برتر کوئی دوسرا مقام نہیں۔

ایک مثال اور لیجیے۔ "چاہِ زنخ" صوفیا کے ہاں "مشکلات اسرار مشاہدہ" ہے نہ کہ تھوڑی کا گڑھا نہیں۔

تشریح اصطلاحات کی اوپر کی ان چند مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ادبِ تصوف کو سمجھنے کے لیے زیر نظر کتاب کتنی مفید ہے، اور مصنف نے یہ مرتب فرما کر علم تصوف کا تحقیقی مطالعہ

کرنے والوں کی کس قدر مشکل کشائی کی ہے۔

تصوف میں سب سے نازک اور سب سے اہم مسئلہ وجود کا ہے۔ بلکہ اسے مسئلۃ المسائل کہا جاتا ہے۔ "سرِ دلبراں" کے مصنف جناب شاہ سید محمد ذوقی نے آخر کتاب میں مسئلہ وجود پر بھی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ مختصراً یہ ہے: ذات ورا الورا نے جو کہ جملہ قیود و اعتبارات حتیٰ کہ تعقل اطلاق سے بھی منزہ اور ماوراء ہے، پہلا تنزل وحدت میں فرمایا جو حقیقت محمدیہ ہے۔ یہ تجلی اجمالی ہے۔ اور اس میں دو رخ ہیں، بطون و ظہور۔ بطون کا رخ اطلاق ذات کی جانب ہے، اور ظہور کا رخ اجمال صفات کی جانب۔ دوسرا تنزل کثرت میں ہوا۔ اور آثار و صور حسّی و عینی نمودار ہوئے۔ تصوف میں وجود سے ہمیشہ وجود حق تعالیٰ مراد ہوتا ہے اس وجود اور کائنات کے مابین کیا تعلق ہے، اسے سمجھانے کے لیے صوفیہ آئینہ کی مثال دیتے ہیں۔ یہ وجود ہمیشہ سے ایک حالت پر قائم ہے (الآن کما کان)، کائنات کو یوں سمجھیے جیسے آئینہ میں کسی شخص کا عکس ہو۔ وہ عکس ایک لحاظ سے اس شخص کا "عین" ہوتا ہے۔ اور ایک لحاظ سے اس کا عین نہیں ہوتا۔

کتاب "سرِ دلبراں" تصوف کے معارف و حقائق کو سمجھانے کی ایک بڑی اچھی کوشش ہے اور ہمیں امید ہے علمی حلقوں میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہے طباعت، کاغذ، کتابت اور جلد سب اعلیٰ درجہ کی ہے۔ بڑے سائز کے ۴۸۰ صفحے ہیں۔ ارزاں قسم کی قیمت دس روپے اور اچھے کاغذ والی کی قیمت پندرہ روپیہ ہے۔

ناشرین: محفل ذوقیہ، ڈون ہاؤس۔ ملی روڈ، کراچی کینٹ۔

اسلام کا معاشی نظام اور معاشی نظریات | تصنیف مولانا سید امین الحق صاحب

ناشر: شعبۂ تعلیم و مطبوعات محکمۂ اوقاف (مسجد شاہ چراغ) لاہور

آج کل ہمارے ہاں "معاشیات اور اسلام" کا مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اور ہماری مختلف سیاسی جماعتیں اس بارے میں اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کر رہی ہیں۔ بہر حال اس امر سے تو کسی سیاسی جماعت کو انکار نہیں کہ اسلام نے معاشیات کے متعلق کچھ بنیادی اصول تلقین کیے